کلامِ فیض

Sem 5
CC-12

فیض احمد فیض ان معدودے چند شخصیتوں میں سے ہیں جن کا قوم اردو ادب کے لئے غنیمت ہے بلکہ جن کی ذات سے اردو شاعری کی آبرو قائم ہے۔

فیض ۱۹۱۱ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہی حاصل کی۔ لاہور سے انگریزی اور عربی میں ایم۔ اے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۳۲ء میں ایم۔او کالج امرتسر میں انگریزی کے لیکچرر ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران فاشزم سے اپنی نفرت کے اظہار کے لئے فوج میں ملازمت کی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان ٹائمز کے مدیر رہے۔ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں مارچ ۱۹۵۱ء سے اپریل ۱۹۵۵ء تک کا زمانہ دیگر سیاسی قیدیوں کے ساتھ سرگودھا، لائل پور، حیدرآباد (سندھ) اور منٹگمری کی جیلوں میں قید و بند کی جملہ صعوبتوں کے درمیان گذرا۔ جمہوریت، روس، الجزائر اور دیگر ممالک کا کئی بار سفر کیا۔ روسی حکومت نے ان کی نظموں کے ترجمے شائع کئے۔ امن بین الاقوامی میں اپنے اعلیٰ مقام سے انہیں سرفراز کیا۔ ان کے مطلع کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں نقش فریادی، دست صبا، زندان نامہ، دست تہ سنگ، سر وادیٔ سینا خاص طور سے قابل تعریف ہیں۔

فیض کا محبوب "موضوع سخن" کیا ہے! فیض نے اسی عنوان سے ایک نظم میں اسکی وضاحت کی ہے۔ اور اپنے دو محبوب موضوعات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ حدیث حسن و عشق اور محنت کش طبقہ کی ترجمانی۔ اس نظم میں حسن و عشق کے معاملہ میں انہوں نے لینن سے کام لیا ہے۔ اس سے بعض نقادوں کو یہ گمان گذرا ہے کہ یہی ان کا اصل موضوع ہے۔ اشتراکی خیالات کی نوعیت ثانوی بلکہ رسمی قسم کی ہے۔ حالانکہ فیض نے جہاں اس نظم میں حدیث دلبری کا بیان چٹخارہ سے کیا ہے وہاں کسان، مزدور اور متوسط طبقہ کے بیان میں درد و سوز کی انتہا ملتی ہے۔ انہیں دو موضوعات کے اشارہ تقریباً تیس سال بعد لکھی گئی نظم "سوچنے دو" میں بھی ملتا ہے۔ لیکن ان نظموں سے کہیں زیادہ سوز و گداز ان کی نظم "انتساب" میں ہے۔ جہاں انہوں نے دہکتے ہوئے شہیدوں کی خاموں مخلوق کی تلخیوں حالی کا ذکر بڑے درد بھرے لہجہ میں کیا ہے۔

فیض کی شاعری کی ابتدا حسن و عشق سے ہوئی ہے، نقش فریادی کے پہلے نصف حصہ کے مندرجات کا بالغ موضوع یہی ہے۔ مگر جیسا کہ انہوں نے خود بیان کیا ہے کہ "میری محبوب نہ مانگ" سے غم جاناں اور غم دوراں ایک ہی تجربہ کے دو پہلو بن جاتے ہیں۔ چنانچہ جوں جوں ہم تاریخی ترتیب سے فیض کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تقاضی سنگ تراشی میں خم ہوتی نظر آتی ہے۔ فیض کی شاعری ۱۹۳۸ء کے اردگرد آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ایک طرف غزل گو فکر و شعور کے تیسرے دریچے بند کر کے اپنی ذات کے اندر گم تھے۔ تو دوسری طرف رومان نگار شعراء ان دریچوں سے پرواز کر کے خدا تو سے ماورا ایک نئی دنیا میں قیام پذیر ہو چکے تھے۔

فیض نظریاتی اعتبار سے اشتراکی ہیں۔ اردو کے روایتی شعراء کے برعکس اور اوائل عمر ہی سے ان پر کھل گیا تھا کہ "اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اول تو ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اگر ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے۔" ان کا عقیدہ عناصر قدرت کے بے بہا ذخائر پیدا اور بعض اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکین ہوس

کے لئے نہیں، بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لئے کام میں لائے جانے چاہئیں۔ وہ فن کو مشاہدہ
ہی نہیں بلکہ جدوجہد بھی شمار کرتے ہیں ان کے نزدیک "حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد
کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی
تقاضا ہے۔ فن اس زندگی کا ایک جزو ہے اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو
ہے۔ اور ان کا ایمان ہے کہ سب رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود ہم کامیابی کی شاہراہ
پر مسلسل آگے بڑھتے جائیں گے۔ پروفیسر محمد رشید فیض کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:
"فیض جہاں گرد، ان کی فکر و تخیل جہاں پیما اور شہرت جہاں گیر ہے
یہ نام اب سرحدوں، زبانوں، قوموں، نظریوں اور عقیدوں کی ساری
حدوں کو پار کر کے ہمہ گیر مقبولیت کی زندہ علامت بن چکا ہے۔
اس کا شمار ان چند ناموں میں ہے جن کے سہارے جدید اردو شاعری
نے بین الاقوامی شناخت حاصل کی۔ یہی وہ نام ہے جو گزشتہ
چالیس سال سے دل کو چھونے والے انقلابی نغموں، حسن و عشق کے
مدھر گیتوں اور جبر و استحصال کی طاقتوں کے خلاف احتجاجی
تیوروں سے پہچانا جاتا ہے۔ جو اپنے عہد کی انسانیت اور اس
کے ضمیر کی موثر آواز ہے۔"
فیض کی شاعری میں غنائیت اور رجائیت کے جو عناصر ہر دور میں نمایاں رہے ہیں۔
اس کا جوہر یہی زندگی کے سوز و ساز، دکھ سکھ کے اجتماعی احساس میں اپنے وجود کو
پانے کی خواہش میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رک جائیں گی سب زیست کی راہیں
آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے
لو خیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے

فیض نے ایک متوازن اور معتدل راستہ ہی اختیار کیا۔ ایک طرف تو انہوں نے اردو شاعری
کی لغوی اور فنی روایات کو پیش نظر رکھا اور کہیں اس سے انحراف بھی کیا تو اس قدر
کہ دوسروں کے ذہن کو ناخوش گوار دھچکا نہ لگے۔ اور دوسری جانب جدید امریکی اور فرانسیسی
شعراء کے ابہام سے قطع نظر کر کے غزل کے محل کو اپنے تجربوں کے اظہار کے لئے استعمال کیا۔
فیض کا کلام عصری مسائل کا ایک خوبصورت آئینہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں حسرت میں کلام میں
"معراج تلک" اور چکی کی مشقت، کے ذکر کے علاوہ اپنے دور کے سماجی اور سیاسی
نزاع کا کوئی نشان نہیں ملتا اور جگر کی شاعری جب داغ اور امیر کا دامن چھوڑ دیتی
ہے تو سپاٹ صحافت بن کر رہ جاتی ہے۔
فیض کے علاوہ جوش، مجاز، سردار جعفری اور کیفی کے کلام میں
بھی سرمایہ داری کے استحصال، مہنگائی، سیاست کی ریشہ دوانیوں اور حالات کو بدل
دینے کے عزم کا تذکرہ ملتا ہے۔ مگر جوش اور مجاز کے یہاں شاعری سے زیادہ

خطابت ہے۔ ان کے کلام میں لفظوں کی بھرمار اور تکرار سے خماری کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے۔
جب کہ فیض کی نظموں میں ضبط، اعتدال اور تحیر حسن کی کارفرمائی ملتی ہے۔ ہر نظم
اپنی تراش کے لحاظ سے ایک حسین مجسمہ کی مانند ہمارے تصور کے سامنے ابھرتی ہے۔
اور آہستہ آہستہ ہمارے قلب و نظر میں مسرت اور بصیرت کا ایک ابدی تاثر پیدا
کرتی ہے۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

فیض کے اکثر نقاد یہ سوچتے ہیں کہ ان کی شاعری میں یہ تب و تاب، فکر میں آفاقیت
اور لہجہ میں استقامت کہاں سے آئی؟ بلاشبہ فیض کی اس انفرادیت کے بہت سے سرچشمے
ہیں۔ لیکن اس کی اساس کردار و عمل اور احساس و اظہار کی وہ کامل مطابقت اور شفاف
ہم آہنگی ہے جو اردو کے بہت کم شاعروں کا مقدر بنی ہے۔ فیض نے انقلاب کے جس تصور
سے پیمان وفا باندھا ہے اس کی ہر آہٹ، ہر ادا، ہر رنگ، ہر کیفیت کو اپنے گرد و پیش
انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں غرق ہو کر دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اس نے یہ قربانیاں
دی ہیں بار بار قید و بند کی صعوبتوں سے گذرے ہیں، محرومیوں اور اذیتوں کا زہر پیا ہے
اور تب یہ نسخہ کیمیا ان کے ہاتھ آیا ہے۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسباب غم عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانی دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے۔

فیض مختلف اور متناقض تشبیہوں اور استعاروں سے ہمیں پریشان نہیں کرتے اور نہ ہم
معنی، الفاظ کے سیلاب سے ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خیالات کی چیخ و پکار
جذبات کی فراوانی اور بیانات سے وہ نظم میں بدنظمی پیدا نہیں ہونے دیتے۔ فیض کے عاشق
کو زمانہ کے زور و ستم نے زندگی کے بارے میں بصیرت بھی بخشی ہے۔ اور ایک نئے دور کے
آغاز کی بشارت بھی، چنانچہ جن جبر کے سہارے فریاد کے ان بھولے سے دلوں کو
گزار دینا چاہتا ہے۔ فیض کے یہاں نئے دور کی یہ بشارت ایک رومانی تصور کی
صورت میں دل میں ان قوتوں کا احترام ہے جو اس دور کے آغاز کے لئے مخالف قوتوں
سے برسر پیکار ہیں۔ اور وہ ان سے واقف بھی ہیں۔ جو ارتقاء کے راستے میں ہر قسم
کی رکاوٹیں پیدا کرنے پر آمادہ ہیں۔ مگر ان کی محبت اور نفرت پر رنگ فنی اور ادبی
شعور کا حیرت انگیز ضبط ہے۔ حالانکہ انہی نظموں کی خاطر انہوں نے اپنی عمر عزیز
کے آٹھ سال پاکستانی جیلوں میں شدید سختیوں کے درمیان گذارے ہیں۔ دست صبا
زنداں، اور دست تہہ سنگ کا بیشتر حصہ اسی عہد اسیری کی یادگار ہے۔

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
حدیث یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں۔

فیض کی نظموں پر سجاد ظہیر نے اپنی رائے کچھ اس طرح دی ہے:

"فیض کی ان نظموں کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ان اقدار کا تعلق ہے جن کو شاعر نے ان میں پیش کیا ہے وہ تو وہی ہیں جو اس زمانے میں تمام ترقی پسند انسانیت کی اقدار ہیں۔ لیکن فیض نے ان کو اتنی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیب و تمدن کی بہترین روایات سے رنگ نکالتی ہیں اور نہ شاعر کی انفرادیت، اس کا نرم، شیریں اور مترنم انداز کلام کہیں بھی ان سے جدا ہوا ہے۔ اس کے متحرک اور رواں استعاروں میں ہمارے وطن کے پھولوں کی خوشبو ہے۔"

(سجاد ظہیر۔ سدرہ جنوری 1956ء)

فیض کے کلام میں جو اہم چیز ہمیں نظر آتی ہے وہ ہے زندگی کی کشمکش کا شعور، زندگی کے کمناوے سکون سے نفرت اور زندگی کے تابناک مستقبل سے محبت۔ اور اس کے اظہار کے لئے فیض نے غزل کی ساری روایات کا استعمال کیا ہے۔

دشت تنہائی میں، اے جان جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے تیرے ہونٹوں کے سراب
دشت تنہائی میں، دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور گلاب۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

فیض کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا عشق درد مندی ہے، درد مندی انسان دوستی ہے اور انسان دوستی انقلاب کے پیکر میں ڈھلتی نظر آتی ہے اور اسی کے نتیجے میں ان کے الفاظ استعاروں اور علامتوں میں ایک رجھوتی دلکشی، سرشاری اور پہلو داری پیدا ہو جاتی ہے۔